OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

Al-Qamar, Volume 5, Issue 3 (July-September 2022)

نام نہاد مذہبی ،سیاسی اور س معاشرتی رویوں کا کھوکھلا پن: سعید نقوی کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ

The Hollowness of So-Called Religious Behaviors: A Thematic Study of *Saeed Naqvi's* Fictions

Amber Fatima

Doctoral Candidate Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad

Dr. Sadaf Naqvi

Chairperson, Department of Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad

Abstract

Saeed Naqvi is a well-known poet, scholar and a rising star of Urdu literature. He proved his intelligence through his written works in a short while. Up till now a collection of his fiction has come into sight. His fiction provides a developing outlook towards many social, religious and political issues, social issues discuss society in different dimensions like anti-sentimental attitude of society, misguidedness, immoderate behaviors, old customs, condemn the critics criticizing the new generation, damage arising from old thinking, generation gap, altercation in relationships, household rights etc. His fiction also describes how politics and religion can be used as a tool to fulfill an individual's desire. There we find a pen picture of zero tolerance, cruelty and anti-sentimental attitude in politics caused by capitalism. Saeed Naqvi has enriched Urdu literature with his high work in fiction after discussing issue like unchecked bloodshed of Muslims in the name of religion and many of the same.

Keywords: Rising Star, Intelligence, Anti-sentimental, Immoderate, Critics Criticizing Household Rights, Individual's Desire

تمہید

افسانہ تحریر کرتے وقت سب سے پہلا اہم اور مشکل مرحلہ موضوع کا انتخاب ہے۔ کیونکہ موضوع جتنا اچھا ہو گا افسانہ اتنا ہی کامیاب ہو گا۔ موضوع کا کہانی سے گہرا تعلق ہے۔ موضوع کے علاوہ باقی اجزا بھی اپنی اہمیت کے حامل ہیں لیکن موضوع کا انتخاب ہمیں افسانہ نگار کی وسیع حدِ نگاہ سے متعارف کروانے کا پہلا ہتھیار ہے۔ ”کائنات کے چپے چپے میں افسانہ نگار کے لیے

CC BY

ان گنت اور بے شمار موضوع بکھرے پڑے ہیں، مظاہر قدرت، سمندر، پہاڑ، جنگل اور خدا کی پیدا کی ہوئی جاندار اور بے جان مخلوق پھر ان مخلوقات میں سب سے افضل، سب سے اشرف، سب سے اکمل حضرت انسان اور اس کے بے شمار مسائل اور ان کے علاوہ بے شمار موضوعات ہیں جو ہمہ وقت افسانہ نگار کی نظر اور فکر کو دعوت دیتے رہتے ہیں۔"[1] سعید نقوی کے افسانوں کے موضوعات زندگی کی حقیقتوں کے عکاس ہیں۔ سید سعید نقوی انسانی زندگی کے حقائق اور ان سے جڑے مسائل، زندگی کی تلخ واقعات، کار آمد تجربات اور گہرے مشاہدات کو افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ انسانی زندگی جذبات اور احساسات کا مجموعہ ہے۔ ان جذبات میں محبت، غم، مسرت، غصہ، خوشی، نفرت اور انتقام وغیرہ کا تجربہ تقریباً ہر شخص اپنی زندگی میں کرتا ہے۔ اس پر اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے سید سعید نقوی اپنے افسانوں میں ہمیں معاشرے کے طبقاتی نظام سے آگاہ کرواتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ان موضوعات کے ذریعے انسانی بے حسی اور سماجی جبر کی طرف قاری کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ سید سعید نقوی نہ صرف ایک باشعور قلم کار ہیں بلکہ زبردست مشاہدے کی دولت سے مالامال ہیں۔ جو بھی کردار ان کے ذہن میں آتا ہے وہ اس کے ظاہری خدوخال کی بجائے اس کے باطن کو یوں سکین کرتے ہیں کہ اس کی کوئی خوبی یا خامی پوشیدہ نہ رہے اور موضوع کے ساتھ مکمل انصاف کیا جائے۔ آپ تجربات کو کرداروں میں اتارنے کے فن سے آشنا ہیں۔ "ہمارے اطراف تجربوں، حادثوں، ظلم واستبداد، سخاوت ومہربانی، سفاکی وسنگ دلی، دیا وفریب اور بے غرضی و قربانی کی لاتعداد کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ جو ہماری زندگی کے مجسمے کو ہر لمحہ ایک نئی تراش دیتی ہیں۔"[2]

معاشرتی موضوعات

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ مرزا غالب نے انسان کو حیوانِ ناطق کہا ہے۔ انسان اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ معاشرہ انسانوں کے مجموعے سے ہی بنتا ہے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اکیلا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جہاں افراد معاشرے کے اہم اراکین ہیں وہاں معاشرہ بھی ان کی سوچ، اعمال اور رویوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ معاشرہ جو کہ خود انسانوں کے مجموعے سے مل کر بنا ہے بعض اوقات بہت سے انسانوں کی زندگی میں بربادی اور تباہی کا سبب بنتا ہے۔ آج کا انسان اپنی تخلیق کا مقصد بھلائے بیٹھا ہے اور خود کو معزز ثابت کرنے کی جنگ میں کتنی زندگیاں اپنے پیروں تلے کچل دیتا ہے۔ اس کا احساس اسے شاید مرتے دم تک بھی نہیں ہوتا۔ انسان اپنی خواہشات، احساسات اور جذبات سب اسی معاشرے کے تابع کر دیتا ہے۔ جس سے اسے اتنا فائدہ نہیں پہنچتا جتنا اس کی ذات کو نقصان پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر سید سعید نقوی نے اپنے افسانوں میں مختلف سماجی طبقات کے عام انسان کی محرومیوں کو منفرد انداز میں موضوع بنایا ہے جو کہ حالات کی چکی میں پس رہے ہیں لیکن ان کے اندر حالات کو بدلنے کا یا ان سے لڑنے کا جذبہ بھی موجود ہے۔ سعید سید نقوی کے افسانوی مجموعے "نامہ بر" پر تبصرہ کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ "ان کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اس قلم کار نے دنیا دیکھی ہے۔ زندگی کو برتا ہے اور انسانی نفسیات کی گتھیوں کا اسے پوری طرح علم ہے۔"[3] معاشرتی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمارے ہاں بہت سے مسائل ایسے ہیں جو خود چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں کہ ہم پر قلم کاری کی جائے تاکہ لوگوں کی نظروں سے گزریں اور کوئی سدباب لائحہ عمل میں لائیں۔ سید نقوی نے ان کو اپنے افسانوں کے ذریعے جلا بخشی۔ افسانہ گار ان مسائل کو تخلیقی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جن کو ایک عام انسان غیر اہم سمجھ کر آگے چل دیتا ہے۔ ہمارا سماج اور معاشرہ اس وقت ایک کشمکش میں مبتلا ہے۔ امجد اسلام امجد معاشرتی موضوعات کو زیر بحث لانے پر ڈاکٹر سید سعید نقوی کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ "ڈاکٹر سعید نقوی امریکہ میں رہائش پذیر ہیں مگر ان کی کہانیوں کی فضا سر تا سر مشرقی ہے۔ جن میں انسان دوستی اور طبقاتی تقسیم کے پیدا کردہ مسائل کو بڑی خوبصورتی اور ہنر مندی سے اجاگر کیا گیا ہے۔"[4] سعید نقوی کو معاشرے پر گہری نظر رکھنے

کے بارے میں قمر علی عباسی کچھ اس انداز سے سراہتے ہیں کہ "ان کا ہر افسانہ اپنی جگہ ایک مکمل طنز اور معاشرے پر تنقید ہے۔"[5] غربت، انا، انسانی کرب اور پچھتاوے کی بہترین مثال پیش کرتا سعید نقوی کا افسانہ "پتلی تماشہ" جس میں ایک مداری کی بے کسی اور لاچاری کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ جو بے جان کٹھ پتلیوں کا تماشا لگا کر اپنی انگلیوں کی پوروں کی اذیت کو پردے کے پیچھے چھپا کر تماشبینوں کے چہروں پر مسکراہٹ لاتا ہے۔ ایک جھگی اس مداری کی کل کائنات ہے۔ جہاں وہ اپنی کٹھ پتلیوں کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے اور اکیلا پن ختم کرنے کے لیے انہیں کٹھ پتلیوں سے پیار کرتا ہے۔ انہی پر غصہ کرتا ہے اور انہی سے جھگڑتا ہے۔ باسی، روٹی، دال پر گزار کرنے والا شخص ہمارے معاشرے کے نچلے طبقے کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو ان کم وسائل میں بھی مطمئن زندگی گزارتے ہیں اور شکایت نہیں کرتے۔ "دن ڈھلنے تک اس کی انگلیاں دکھنے لگتیں۔ پوریں اس کے اشارے پر چلنے سے انکار کر دیتیں۔۔۔ اس پر کچھ تماشبین ہنس پڑے مداری کا منہ سرخ ہو گیا۔ وہ تو شکر ہے کہ پردے کے پیچھے کھڑے ہونے کی وجہ سے اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔"[6]

معاشرے کی ایک تلخ حقیقت سید نقوی کے افسانے (کالی آندھی) میں نظر آتی ہے۔ یہ معاشرے کا وہ رخ ہے جس کو ٹھیک کرنے کی ازلوں سے کوشش جاری ہے۔ مذہب نے عورتوں کے حقوق میں پہلا حق تعلیم کا رکھا ہے۔ لیکن ابھی تک پسماندہ علاقوں میں عورتوں کی اس حق تلفی کو مردانگی اور فخر کا صیغہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ برائی نہ جانے پسماندہ علاقوں کی ہے یا پسماندہ ذہنوں کی جو عورتوں کو اس کا مقام دینے پر آمادہ نہیں ہیں اور اس بات کو معاشرے کے بگاڑ کی علامت بنائے بیٹھے ہیں۔ جبکہ عورت کی تعلیم معاشرے کے لیے اس قدر ضروری ہے جیسے زندگی کے لیے کی۔ اور عورت کی تعلیم کے بغیر نسلیں تو کیا قومیں بھی ترقی نہیں کر سکتیں۔ "واقعات کا تسلسل انسانوں اور قبیلوں کے ارتقا پر اثر انداز ہوتا ہے، خاص طور پر نوجوانوں کے ارتقاء پر۔۔۔ ان کے مقابلے کے لیے قومیں نئے راستے نکالتی ہیں۔ اپنی بہترین اچھائیوں کے ساتھ ایک اکائی بن جاتی ہے اور سرخرو ہو کر ایک بہتر قوم کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔"[7] خانم سکول کی وہ استانی ہے جو بچیوں کی تعلیم کو نسلوں کی بہتری کے لیے ضروری سمجھتی ہے اور بار بار دھمکیوں کے باوجود سکول کو بند نہیں ہونے دیتی۔ یہاں تک کہ اپنی جان کی بازی ہار بیٹھتی ہے۔ بے حس معاشرے کے بھیانک چہروں کی اصلیت یہ ہے کہ ان کے لیے انسانی جان کوئی معنی نہیں رکھتی۔ "مجھے پتا تھا، تم ایسے باز نہیں آؤ گی اور مزہ چکھانا ہی پڑے گا۔ یہ تیزاب چہرے کو ایسا گلزار کر دے گا کہ جب بھی آئینہ دیکھو گی اس میں بے غیرتی کا بدصورت چہرہ نظر آئے گا۔"[8]

معاشرے کی ذہنی پسماندگی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہمیں افسانہ (زود پشیمان) کے کردار شرافت اللہ کی شکل میں دکھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ جو اپنا گیارہ سالہ بیٹا بچانے کی کوشش میں اپنے ڈاکٹرز پر بے یقینی کا مظاہرہ کرتا ہے اور امریکہ کے ڈاکٹرز کو ان پر ترجیح دیتا ہے یعنی گھر کی مرغی دال برابر۔ جس کا جواب ڈاکٹر صاحب کچھ یوں دیتا ہے کہ "کیا امریکہ کے ڈاکٹر ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ وہ بھی وہی کتابیں پڑھتے ہیں جو ہم پڑھتے ہیں، فرق صرف ذہنیت کا ہے۔ بس تم لوگوں کی غلامانہ ذہنیت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔"[9] معاشرتی حقائق سے پردہ اٹھاتا سعید نقوی کا افسانہ "سراب" جو معاشرے کے ان کرداروں کے دل کی آواز ہے جو دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے اپنے پیاروں سے دور پردیس میں جا بستے ہیں اور زبردستی خوش مزاجی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں تاکہ ان کے پیارے ان کی جدائی کے علاوہ کوئی غم نہ دیکھ پائیں۔ بلکل اسی طرح ان کے پیارے بھی ان کو اپنی پریشانیوں سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اس افسانے میں احمد اور رضا ایسے ہی دو کردار ہیں۔ رضا تلاشِ معاش کے سلسلے میں باہر جاتا ہے لیکن تین ماہ بعد فراڈ کیس میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ساری زندگی جیل میں گزارتا ہے لیکن گھر والوں کو خطوط کے ذریعے جھوٹی شان و

شوکت کے قصے بھیجتا رہتا ہے۔ اسی طرح ادھر اس کا عزیز ترین دوست احمر جو حادثے میں اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے لیکن اس بات کو رضا سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے تاکہ وہ امریکہ میں سیٹ ہو جائے۔

سعید نقوی کا افسانہ "ہم جولی" معاشرے کے ان لوگوں کی آواز ہے جو اس تکلیف سے زندگی میں ایک بار تو ضرور گزرتے ہیں۔ رانوں کے باپ جیسے مجبور باپوں سے دنیا بھری پڑی ہے جو اپنا فرض پورا کرنے کے لیے اپنا آپ بکاؤ رکھ دیتے ہیں۔ جہاں بیٹی کی گزرتی عمر ان کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتی ہے۔ وہاں ان کے چہرے کی جھریاں جہیز کا مطالبہ کرنے والے کے آگے اور بھی سمٹ جاتی ہیں۔ لڑکے والوں کے مطالبات معاشرے میں ناسور بن کر پھیلے ہوئے ہیں۔ جس نے ایک مجبور باپ کی خواہشوں کو زنجیر میں جکڑ رکھا ہے۔ افسانہ (آخرِ شب) غرور و تکبر سے بھرپور معاشرے پر طنز ہے۔ جس میں ایک ایسے فالج شدہ شخص کی بے بسی اور لاچاری کو موضوع بنایا گیا ہے جس نے اپنے عہد شباب میں لوگوں کو حقیر اور کم تر سمجھا۔ تکبر میں شاید وہ بھول گیا تھا کہ ہر ذی النفس کو زوال ہے۔ نرسوں سے پانی کے گھونٹ کے لیے التجا کرنے والا اپنے جوبن میں جیسے لوگوں کو دھتکارتا تھا۔ آج وہی اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اوسان تو تب خطا ہوئے جب اپنے بارے میں نرس کے منہ سے سنا۔ "کم بخت بڈھا مرتا بھی نہیں۔"[10] اللہ کی لاٹھی بڑی بے آواز ہے۔ وہ انسان کو اس کی اصلیت و وقعت کا احساس دلانے کے لیے اس قدر بے بس کر دیتی ہے تاکہ وہ اپنا احتساب کرے، ضمیر کو جگائے اور سیدھے راستے کا انتخاب کرے۔

ہمارے سماج کے اندر پائی جانے والی بیماریوں کی عکاسی کا خوبصورت ترین اظہار افسانہ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ "بند گلی" سعید نقوی کا ایسا ہی ایک افسانہ ہے۔ جس میں فقیرنی کے رحم میں موجود بچے کی کہانی کے ذریعے معاشرے کا غلیظ چہرہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کی سنگدلی، بے رحمی، لالچ اور طاقت کے نشے کی بدبو سونگھ چکا ہے۔ یہ نشہ پولیس کرتی ہو، سپاہی، ڈاکٹر یا فقیر کرتے ہوں۔ یہ لت ایسی ہے کہ معاشرے کو تنزلی کا شکار ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ بچہ مکر و فریب سے بھری دنیا کی بجائے ماں کے شکم میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے اور یہ بات ڈاکٹر صائمہ بھی جان چکی ہیں۔ "یہ بچہ ابھی دنیا میں آنے کے لیے تیار نہیں۔ مریضہ کی بجائے دنیا کو ایک نئی ڈرپ لگاؤ۔"[11]

افسانہ "دلدل" ہمارے معاشرے کے ذہنی، جذباتی اور فکری رجحان کا آئینہ دار ہے۔ جس میں غیرت کے نام پر قتل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے کا کردار جاوید جو دو بیٹیوں کا باپ ہے۔ ندا بڑی بیٹی کو اس کا ماموں جو کہ نیویارک سے آیا ہے، لینے جاتا ہے۔ جہاں وہ ایک نوجوان کو مشکوک حرکتیں کرتا دیکھتا ہے۔ ندا انہی کے بارے میں سب بتاتی ہے اور ان کی غلط فہمی دور کر دیتی ہے۔ ماموں بھانجی کے عزت دار گھرانے کی بیٹی ہونے کا ثبوت پیش کرنے پر فخریہ انداز میں رات کے کھانے پر سب کو بتاتا ہے۔ سالے کے روکنے پر وہ اسے تہذیب کے فرق پر طنز کرتا ہے کہ تم باہر سے آئے ہو اس لیے تمہارے لیے یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی لیکن اس کے لیے اب انا کا مسئلہ ہے۔ "یہ اس پہناوے جینز کا اثر ہے، سور کا گوشت کھانے والے کے ساتھ رہتے ہو اسی لیے ڈرپوک اور بے غیرت ہو گئے ہو۔"[12]

سعید نقوی نے افسانہ نگاری میں بھی اپنے ڈاکٹر ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ آپ اپنے اردگرد کے ماحول سے افسانے کے لیے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اور اس کی نوک پلک سنوارنے کے لیے ایک دلچسپ کہانی بُنتے ہیں۔ ان کا افسانہ "پرانا جرم" بھی ان کے فن کا عکاس ہے۔ یہ کہانی ایک آٹزم "Autism" کے شکار بچے کی ماحولیاتی نفسیات پر مبنی ہے۔ جو افسانہ نگار اسی کی زبانی بیان کرواتے ہیں۔ "آٹزم" متغیر شدت کا ایک ترقیاتی عارضہ ہے جو معاشرتی تعامل اور مواصلات میں دشواری اور سوچ و سلوک کے محدود نمونوں کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ایک ایسی ذہنی بیماری جس سے خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے بچے ساری زندگی اپنی ذات کے متلاشی رہتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ارشد بھی اس بیماری کا شکار ہے اور لوگوں کے اوٹ پٹانگ

سوالات سے تنگ آکر اون کی سلائیاں کانوں میں گھسا کر خود کو سماعت سے محروم کر لیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ اب زندگی آسان ہو جائے گی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ ارشد کو ہونٹوں کی جنبش سمجھنے کی صلاحیت عطا کر دیتی ہے۔ جب اس کا بھتیجا بھی اس بیماری کا شکار ہوتا ہے وہ اسے بھی سماعت سے محروم کر کے پرایا جرم اپنے سر لے لیتا ہے۔ ”کاش میں اس دن ہی آئینہ دیکھ لیتا تو آئندہ آنے والے کئی صدموں سے جاں بر ہونے میں اتنا وقت نہ لگتا۔“[13] اس افسانے میں معاشرے کے معیارات کو بیان کیا گیا ہے کہ لوگ معذور لوگوں کے ساتھ کیسا رویہ رکھتے ہیں۔ ان ظالم لوگوں کے مطابق معذور افراد کو پیدا ہوتے ہی مار دینا چاہیے۔ ہم اس معاشرے کا حصہ ہیں جہاں اگر معذور بچہ گھر میں پیدا ہو جائے تو اسے رحمت یا نعمت کی جگہ آزمائش کا نام دیا جاتا ہے اور ان کو بوجھ سمجھ کر گھر کے کسی کونے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ افسانہ (سخت جانی ہائے تنہائی) کوئلے کی کان میں ناگہانی آفت کے باعث پھنس جانے والے مزدوروں کی مشکلات اور الجھنو کے ساتھ ساتھ ان کے مالک کی انسانیت ہمدردی کی کہانی ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے کان کے اندر اور باہر موجود لوگوں کے حالات و کیفیات کی ماہرانہ انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ یہ کہانی اچانک آنے والی آفت کی وجہ سے پھیلا خوف وہراس سے شروع ہوتی ہے لیکن باہمی تعاون کی وجہ سے اس کا اختتام خوشگوار ہوتا ہے۔ یعنی پہلی بات کہ اگر سربراہ چاہے وہ گھر کا ہو یا دفتر کا ایماندار اور ہمدرد ہو تو بڑی سے بڑی مصیبت بھی ٹل جاتی ہے اور دوسری بات اس میں آپس کا سلوک اور اتفاق ہے جو انسانیت کی لیے پلر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ”دھوپ کی تپش“ ایک ایسا افسانہ ہے جو ہمارے معاشرے کے سب سے خوبصورت پہلو باپ اور بیٹے کی محبت کی کہانی بیان کر رہا ہے۔ خاندانوں کا حسن اگر پیار محبت ہے تو باپ وہ پہلا واحد وسیلہ ہے جو اس کا آغاز بھی کرتا ہے اور اس کو برقرار بھی رکھتا ہے۔

ان کے ہونے سے بخت ہوتے ہیں
باپ گھر کے درخت ہوتے ہیں

باپ اور بیٹے کی محبت کے حوالے سے سعید نقوی کا ایک اور افسانہ ”تمازت کے رنگ“ ہے۔ جس میں ایک باپ اور بیٹے کے درمیان دوستانہ تعلقات اور جنریشن گیپ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار فراز جو کہ ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہے لیکن عزت کی خاطر محبت قربان کر دیتا ہے لیکن جب اس کا اکلوتا بیٹا باپ کی تاریخ دہراتا ہے تو فراز اس کو مختلف طریقوں سے سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ”میں مشکل کو طول دینے کا قائل نہیں تھا۔ بہتر ہے کہ ابتداء میں ہی اس کا سامنا کر لیا جائے ورنہ وقت کے ساتھ اکثر مشکل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یوں اسے پال پوس کر بڑھانے کا فائدہ۔“[14] لیکن سرمد باپ کی داستان کو ہنسی میں اڑا جاتا ہے۔ اس افسانے میں معاشرے کے جس پہلو سے پردہ ہٹایا جا رہا ہے وہ یہ کہ آج کل کی نوجوان نسل امیر بننے کے چکروں میں شارٹ کٹ کا استعمال کرنا اپنا حق سمجھتی ہے۔ ہماری اسی ذہنیت نے معاشرے میں بگاڑ پیدا کیا ہوا ہے کہ جسے امیر ہونا ہے وہ امیر لڑکا یا لڑکی ڈھونڈے اور اس سے شادی کر کے امیر ہو جائے۔ رشتوں کے تقدس کی پامالی کا اور کیا ثبوت ہو گا کہ رشتۂ ازدواج جیسے مخلص فریضے کو آج کل دولت کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔
امریکی معاشرے میں پردیسیوں کی صورت حال کو پیش کرنا سعید نقوی کا افسانہ ”ذوقِ اسیری“ جس کا مرکزی کردار ”میں“ دیارِ غیر میں دو سال تک ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کرتے کرتے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے کیونکہ بھوک اور بے روزگاری ایسی مجبوریاں ہیں جو انسان کو صحیح اور غلط کا تصور بھلا دیتی ہیں اور وہ اپنے ضمیر کا سودا کر لیتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بھی معاشرے کا اچھا شہری ثابت ہونے کے لیے ہجرت کی مشکلات سہتے سہتے بیوی کی ناراضی اور اصرار پر جعلی سرٹیفکیٹ

کا سہارا لے کر طب کے شعبے سے وابستہ ہو جاتا ہے اور پھر اس راستے کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ واپسی کا کوئی امکان ممکن نہیں یعنی برائی کے نشے کی لت بہت بری ہے۔

افسانہ ''درخت'' میں معاشرے کے سب سے اہم کردار کی بات کی جا رہی ہے یا یوں کہا جائے کہ معاشرہ ان کی ہی وجہ سے قائم ہے تو غلط نہ ہو گا۔ معاشرے کو پروان چڑھانے والے اور اس کی بنیادیں مضبوط کرنے والے اہم عناصر یعنی والدین معاشرے کے وہ پلر ہیں جن کے بغیر سر کی چھت یا گھر کی چھت باقی نہ رہے۔ وہی اولاد جن کے لیے ماں باپ دن رات مشقت کرتے ہیں ان کی تربیت کو اتنا ہی پھل نہیں ملتا کہ بڑھاپے میں ان کا سہارا بن جائیں۔ بابو جی اس افسانے کا مرکزی کردار جس نے قلیل آمدنی میں سات افراد کا کنبہ چلایا۔ نیک بخت جیسی ماں ہمارے متوسط طبقے کے قریباً ہر گھر میں پائی جاتی ہے۔ جو اپنے بچوں کے لیے جاں نثار کرنے والی اور شوہر کی وفادار ہوتی ہے۔ نیک بخت شوہر کے مرنے کے بعد اس کا لگایا گیا درخت بھی کاٹنے نہیں دیتی۔ یہی اس کی آخری وصیت بھی تھی۔ ''نہیں اماں، میں بھائی کو اسے نہیں کٹوانے دوں گا۔ میں اٹھا لیا کروں گا پتے۔ چھوٹے بیٹے نے ماں کا زرد چہرہ دیکھ کر اسے لپٹا لیا۔ اس شدت سے وہ ڈر گیا تھا۔''[15]

''سحر ہونے تک'' سعید نقوی کا وہ افسانہ ہے جو معاشرے کے سفید پوش لوگوں کا ذکر کرتا ہے اور ہمیں احساس دلواتا ہے کہ یہ لوگ بھی معاشرے کا حصہ ہیں۔ اس کا مرکزی کردار ایک ماہی گیر ہے۔ جو دو بیٹیوں اور بیوی کی محبت کے ساتھ ساتھ اپنے پیشے کی محبت میں بھی گرفتار ہے۔ سمندر کی لہریں اس کے دل میں بھی ٹھاٹھیں مارتی ہیں۔ ماہی گیری کے ساتھ ساتھ وہ اس قدر تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے کہ کئی کئی راتیں سمندر کی آغوش میں گزار دیتا ہے تاکہ اپنی بیٹیوں کو دنیا کی تمام آسائشیں فراہم کر سکے لیکن اپنی ادھوری خواہشات اور بیٹیوں کے روشن مستقبل کے خواب دیکھتے دیکھتے وہ سمندر کو ہی اپنی جان تھما دیتا ہے۔ ''کوئی اناڑی ہو گا، ایسے آدمی کو سمندر میں نہیں اترنا چاہیے، سمندر کے مزاج کا کوئی بھروسہ ہے؟''[16]

''دائرے سے باہر قدم'' سعید نقوی کا انتہائی خوبصورت افسانہ جس کو آپ نے جی سی ویمن یونیورسٹی کی نشست میں بھی پڑھا اور پورے ہال کو اس کے سحر میں جکڑ لیا۔ اس افسانے کا مرکزی کردار صابر جو اپنا آبائی پیشہ سرانجام دیتے ہوئے اب اپنے والد کی ذمہ داریاں نبھا رہا ہے۔ صابر جیسے کردار ہمارے معاشرے کے ان لوگوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو گاہک کو اپنی پسند نہ پسند کے تحت چیز فروخت کرتے ہیں۔ صابر بھی باقی گھروں میں معمول کے مطابق دودھ دیتا ہے۔ وہ اپنے گاہکوں کے ساتھ کسی قسم کی نرمی نہیں برتتا لیکن بعض گھر ایسے ہوتے ہیں جہاں کچھ حسیناؤں کی وجہ سے نرمی تو کیا دل تک ہارنے کو تیار رہتا ہے۔ ہاں لیکن واضح رہے تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ جیسے کہ فیروز صاحب کے گھر میں بھی ایک حسینا دودھ کا برتن تھامے صابر پر انگارے برسانے کو تیار رہتی ہے۔ ''صابر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ مسکراتی تو صابر کے گھٹنوں کی تھکن کی جگہ کمزوری لے لیتی۔''[17] سعید نقوی کا افسانہ ''بلقیس اور سلیمان'' ایک انتہائی سبق آموز اور آج کی نسل کا رہنما ہے۔ آج کے دور میں لوگ دوسروں کی پسند ناپسند کو اہمیت دیے بغیر اپنی ''میں'' میں گم رہتے ہیں۔ اپنے بارے میں دوسروں سے اچھا کہلوانا چاہتے ہیں۔ یہ سمجھے بغیر کہ شاید دوسرا شخص بھی یہی امید لے کر بیٹھا ہو۔ لوگوں کو خواہ مخواہ متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ ان کی ترجیحات کیا ہیں۔ قیصر اور بلقیس کی مختصر ترین محبت بھی معاشرے کا المیہ ہی سمجھ لیجیے۔ جہاں دونوں ڈنر پر دوسروں کی باتیں کرنے میں وقت ضائع کرتے ہیں اور پھر قیصر اپنی تعریفوں کے پل باندھنے لگتا ہے۔ بلقیس شادی سے انکار کا جواز بھی یہی پیش کرتی ہے کہ اب لڑکیاں سلیمان کی بلقیس جیسی نہیں کہ تخت و تاج دیکھا تو دل ہار بیٹھی، آج کل کی نسل اتنا تو ضرور جانتی ہے کہ اگر ذہنیت نہ ملتی ہو تو دوسروں کے ساتھ بندھے رہنا اپنے تو وقت کا ضیاع ہے ہی لیکن دوسرے کے جذبات سے کھیلنے کے

مترادف بھی ہے۔ "ایک دوستانہ مشورہ ضرور دوں گی سلیمان بن کرمت ملیے گا۔ مردو ہیں کھڑے رہ گئے، وقت آگے بڑھ گیا ہے۔۔۔ میرا ضمیر مجھے کوس رہا تھا اور میں ارتقاء کو کوس رہا تھا۔"[18]

"عزت" سعید نقوی کا افسانہ جس کا مرکزی کردار ہمارے معاشرے کی وہ عورت ہے جو معاشرے کے عزت دار لوگوں، امراء اور شرفا کے لیے تسکین کا باعث بنتی ہے۔ وہ تسکین جو انہیں حرام کا کمایا ہوا پیسہ حرام کاموں پر لگا کر ملتی ہے۔ زرمین ایک بازاری عورت ہے، اس نام سے تو سب واقف ہوتے ہیں لیکن سعید نقوی ہمیں اسی عورت کے دوسرے رخ سے آشنا کرواتے ہیں۔ جس میں ہمیں زرمین ایک ضدی اور انا پرست عورت دکھائی گئی ہے جو ان امراء و شرفا کی نام نہاد دوستی، دولت اور عزت کو لات مار دیتی ہے کہ کسی بھی بڑے آدمی کی دولت ہر عورت کو مرعوب نہیں کر سکتی بلکہ اپنی عزت پر اسے پورا اختیار حاصل ہے۔ "زخمی صاحب! میں بھی شاید کچھ آپ ہی جیسے مزاج کی عورت ہوں۔ عزت کو سب سے اہم سمجھتی ہوں۔ بس میں نے اپنی عزت اپنے ازار بند سے نہیں باندھ رکھی۔ میرے پاس یہی تو ہے جو میں جسے چاہوں دینے سے انکار کر دوں۔"[19] سعید نقوی کے افسانوں میں ایسے ایسے موضوعات کا چناؤ کیا گیا جیسے انسانی فطرت سے پیاز کے چھلکے کی مانند ایک ایک تہہ اترتی ہے اور پڑھنے والوں کی آنکھوں میں چبھن کے باعث آنسو آجاتے ہیں۔ اسی طرح ایک افسانہ "رشتوں کے آسیب" ہے۔ جس کو پڑھ کر جذبات کی حدت آنکھوں کے ذریعے بہہ جائے۔ معاشرے کا ایک نازک موضوع جس کی وجہ سے نا جانے کتنی اولادیں تکلیف سہتے سہتے ذہنی مریض بن جاتی ہیں اور شاید اسی لیے آج کل کے معاشرے میں Pain killer سے زیادہ ڈپریشن کی گولیاں بک رہی ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک معصوم بچی جو دس سال کی عمر میں اس کرب سے گزرتی ہے۔ اپنے باپ کے دوست سعد کو اپنے گھر پر دیکھ کر ماں کے کردار پر غلط فہمی کی بنا پر شک کرتی ہے اور ساری زندگی اس سے خفا رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ماں زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ لیکن اپنے باپ کو پارسا سمجھنے والی یہ نوجوان لڑکی جب باپ کی بے وفائی کرنے والی حقیقت سے آگاہ ہوتی ہے تب اس کے پاس کھونے کو کچھ بھی نہیں بچا ہوتا۔ یہ انسانی فطرت معاشرے یا گھروں کی بربادی کا باعث ہے کہ ہم ایک طرف کی بات سن کر دوسرے شخص سے خوامخواہ متنفر ہو جاتے ہیں۔ نہ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہیں نہ ان کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ ساری زندگی خود بھی اذیت میں گزارتے ہیں اور دوسروں کو بھی اذیت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس بیٹی کا حال بھی والدین کے خطوط پڑھنے کے بعد کچھ ایسا ہی تھا۔ "مجھے تو اس کے سامنے خفت اٹھانی پڑی لیکن تم تو اس سے آزاد رہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ تم مجھ سے سال بھر سے بے وفائی کرتے رہے تو تمہارا بت بھی پاش پاش ہو جائے گی۔"[20]

بالکل اسی طرز کا افسانہ "زرد بتی" ہے۔ جس میں مرکزی کردار کا شوہر وفات پا چکا ہے۔ اور اب معاشرے کے مطابق اسے خوش رہنے کا کوئی حق نہیں۔ جوان بیٹا بھی اس کی دوسری شادی کے خلاف ہے۔ "شروع میں تو ایسے لگتا جیسے سب مجھ سے تقاضا کر رہے ہوں کہ اجڑے حال میں رہوں۔ اپنا دکھ چہرے پر سجا کر پھروں، صرف دکھی ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کا اظہار بھی ضروری ہے۔"[21] معاشرے کی برائیوں میں محبت میں بے وفائی تو قسمت کی بات ہے لیکن فراڈ کرنا یا اپنے مقصد کے لیے محبت کا ڈھونگ رچانا ایک الگ موضوع ہے۔ جس میں دھوکہ دینے والے کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کتنی زندگیوں کو زندہ لاش میں تبدیل کرنے والا ہے۔ یہ جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ افسانہ "جھوٹا سچ" میں سعید نقوی اس جھوٹ کو بے نقاب کرتے ہیں جو معاشرے کو کسی دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار "آدم" کچھ اس طرح اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے دو لڑکیوں کے جذبات سے کھیل جاتا ہے اور نادم بھی نہیں ہوتا۔

سیاسی موضوعات

لکھنے والا اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے جس کے حق میں دلائل بھی پیش کرتا ہے۔ پوری دنیا اس وقت جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہے ان پر ہر شہری پریشان اور خوف وہراس کا شکار ہے۔ آئے روز کوئی نیا حادثہ کوئی سانحہ دل دہلانے کو تیار ہوتا ہے۔ ڈکیتیاں، شاہراہوں پر لوٹ مار، قتل وغارت اور بم دھماکوں کی بھرمار ہے۔ حتیٰ کہ اندرون خانہ بھی کوئی شہری محفوظ نہیں ہے۔ کیا ان جرائم کو روکنے والا کوئی نہیں یا جو لوگ موجود ہیں کیا وہ سیاست سیاست کھیلنے میں مصروف ہیں۔ پولیس اور دوسرے ادارے کیوں ناکام ہوگئے ہیں۔ یا ہم اسے واقعی ناکامی کا نام دیں گے یا کسی سیاسی مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ اس خاموشی کے پس پردہ کون سے عوامل ہیں جو ان جرائم کو روکنے کے لیے کوئی حکمتِ عملی پیش نہیں کر رہے۔ یہ سوال سبھی باشعور ذہنوں میں پنپتا ہے۔ شاید ان سب کی وجہ لاقانونیت یا جزا و سزا کا فقدان ہے کیونکہ یہاں صاحب استعداد باعزت بری ہوتا ہے اور کمزور انسان کو تمام زندگی جیل کی چکی پیسنا پڑتی ہے۔ غریب آدمی کی زندگی البتہ جیل سے باہر بھی کال کوٹھڑی کی مانند ہی ہے۔ ”سیاست سے مراد حکومت کاری کا علم، کئی حکومت، قوم یا کسی مملکت کی حکمت عملیاں۔“[22]

سعید نقوی نے اپنے بیشتر افسانوں میں سیاست کو موضوع بنایا ہے اور ایک خوبصورت پیرائے میں کہانی ڈھال کر لوگوں کو معاشرے کے اس بھیانک رخ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ قانون کی دھجیاں اڑانے کی ایک عمدہ مثال سعید نقوی کا افسانہ ”جنگل کا قانون“ ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ جس میں ایک مظلوم مورنی عدالت سے انصاف کی طلب گار ہے لیکن اسے انصاف دینے کی بجائے الٹا اس کی کردار کشی کر دی جاتی ہے۔ ایک طرف مجرم کے خلاف چشم دید گواہ پیش نہ کرنے پر اسے باعزت بری کر دیا جاتا ہے تو دوسری طرف مظلوم مورنی کو عدالت سے تو کیا اپنے علاقے سے بھی رسوا کر کے نکال دیا جاتا ہے۔ ”تینوں لکڑ بھگے اس واردات سے انکاری ہیں۔ اس صورتِ حال میں کوئی گواہ موجود نہیں۔ مزید یہ کہ شمالی جنگل کے جانوروں کے بیان کے مطابق مورنی کا چلن اشتباہ کا باعث ہے۔ ایسے میں یہ عدالت لکڑ بھگوں کو باعزت بری کرتی ہے۔“[23]

سعید نقوی کے ایک اور افسانے ”سراب“ میں سیاسی صورتِ حال احمر کی زبانی یوں بیان کروائی جارہی ہے کہ قاری آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سیاست کی آڑ میں ریاست پر جبر کرنا پرانا وطیرہ ہے۔ ”ملک کے سیاسی حالات بھی وہی ہیں۔ چوروں کی سرکار ہے۔ ہماری قسمت دیکھو دودھ کی رکھوالی بلی کے حوالے کر دی ہے۔ ہمارے مسائل ہر سال گزرتے ہوئے سالوں سے زیادہ گمبھیر ہوتے جارہے ہیں۔ غربت گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی ہے۔ روشن خیالی کے سورج کو دقیانوسی سوچ کی تاریکی نے نگل لیا ہے۔“[24]

نائن الیون اور دہشت گردی سے جڑی ہوئی امریکی جارحیت کو ہر زبان میں موضوع بنایا گیا ہے اور اُردو ادب میں سعید نقوی کی مضبوط گرفت اس موضوع کو تھامے ہوئے ہے۔ اس ضمن میں ”دام آگہی“ سعید نقوی کا وہ افسانہ ہے جس میں انہوں نے اس منہ زور طاقت کے ظلم وبربریت کا نشانہ بننے والے ایک قبائلی ملک کو میدانِ جنگ کے طور پر استعمال ہوتے دکھایا ہے۔ دنیا کی اس سپر پاور کے خطرناک عزائم کا شکار لاکھوں انسانوں کی کہانیوں میں سے دو مختلف سوچ رکھنے والے فوجی نوجوان ڈیوڈ اور جم ہیں۔ افسانہ نگار نے ڈیوڈ کا کردار بطور ملک کی ہلاکت آمیز پالیسی پر نکتہ چینی کرنے والا بنایا ہے جبکہ جم اس پر انتقامی غیظ وغضب کے جذبات کا عکاس بنایا ہے۔ یہ کہانی دراصل جم کے احساسِ جرم کی کہانی ہے۔ جس میں مبتلا ہو کر وہ اپنے پچھلے دنوں کو یاد کرتا ہے۔ جہاں ڈیوڈ اس کو یوں تسلی دے رہا ہے: ”ہم یہاں اپنے ملک سے اتنی دور ان جانوروں کو جمہوریت اور تہذیب سکھا رہے ہیں۔ انہیں تو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے۔“[25]

جم اپنے آپ کو ملامت کرتا رہتا ہے اور اس دوران ایک خودکش بمبار سے نبٹتے نبٹتے معذور ہو جاتا ہے۔ اور بیوی بھی اکتا کر چھوڑ جاتی ہے۔ انہیں محرومیوں اور ذہنی اذیت کے دباؤ میں جم خودکشی کر لیتا ہے۔ نائن الیون کے واقع نے لوگوں کو مالی طور پر تو

نقصان پہنچایا لیکن ذہنی طور پر بھی بہت سے لوگوں کے لیے سوالات کی ایسی گہرائیاں کھودی کہ اگر کوئی جواب کی تلاش میں نکلے تو واپس نہ لوٹے یہ سیاسی کھیل ہمیشہ ادھورے سوالات چھوڑتے ہیں۔

مذہبی موضوعات

اُردو ادب روزِ اوّل ہی سے مذہبی اور روحانی اقدار سے سرشار ہے اور مختلف ادیان کے سرچشموں سے زندگی حاصل کی ہے۔ مولانا آزاد علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا مودودی اور مولانا عبد الماجد دریابادی وغیرہ جیسے دانشوران اور مفکرین نے جن اسالیب کے ذریعے مذہبی فکر کا اظہار کیا ہے وہ بھی ادبیات عالیہ کے شاہکار نمونے ہیں۔ ”بہت سارے لوگ ادب اور مذہب کے رشتے پر اجنبیت کا اظہار کرتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ادب کا دائرہ مذہب سے وسیع تر ہے۔ ادب کو دینی مقاصد کے لیے نہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ مغربی ادبا نے لوگوں کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے اور اس کی رغبت دلانے میں ادب کا بھرپور سہارا لیا ہے۔“[26] سعید نقوی کے افسانوں میں ہمیں جا بجا مذہبی موضوعات ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اپنی روایات کو برقرار رکھنے میں ان کے مذہب کا کس قدر عمل دخل ہے۔ اس کی مثال ہمیں سعید نقوی نے افسانے ”کالی آندھی“ میں نظر آتی ہے جس میں ایک سکول ٹیچر جو بے تحاشا رکاوٹوں کے باوجود لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کوشاں ہے اور مایوسی میں ڈوبے لوگوں کی خدا سے مدد مانگنے کی تلقین کرتی ہے۔ ”وہ اکثر اپنی معاون استانیوں سے کہتی نماز ضرور پڑھا کرو۔“[27] خانم مذہبی شعور کی بدولت لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ قرآنی آیات اور احادیث کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ ان کو اپنی مرضی یا حالات کے تقاضوں کے مطابق استعمال کرنا غلط بات ہے۔ ”بھئی تمہاری منطق ہمیشہ الٹ ہوتی ہے۔ قرآن اٹھا کر دیکھ لو صاف لکھا ہے کہ عورت کا مقام گھر میں ہے۔۔۔ آپ غلط کہہ رہی ہیں معاملہ تشریح کا ہے۔ کلام الٰہی سے لوگ اپنے اپنے مقصد کا مفہوم نکالتے ہیں۔“[28]

سعید نقوی کے افسانے ”ابدی کھیل“ میں پرندوں اور جانوروں کی زندگی ان کی افزائش نسل اور اس کے لیے حفاظتی اقدامات کا بیان نظر آتا ہے جو کہ سارے کا سارا قدرت کا کھیل ہے۔ کوئی بھی خوبصورت چیز یا تخلیق دیکھنے کے بعد تخلیق کار کو سراہنے کا جی چاہتا ہے۔ بالکل اسی طرح خوبصورت جملوں میں خدا کی بڑائی اس کی نعمتوں کا تذکرہ اس کی رحمتوں کا نزول اور حرفِ کن پر اعتقاد رکھنے والوں کے لیے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ”انڈے دینے کا عمل بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے گویا احساس دلا رہی ہو کہ ”کن“ پر کچھ شبہ ہو تو دیکھو یہ زندہ کرشمہ دکھاتے ہیں۔“[29]

پوسائیڈن سمندروں کا خدا یونانیوں کو دیوتا تھا جسے عیسائیت کے پیروکار پوجا کرتے تھے۔ سعید نقوی نے ان پیروکاروں کے مذہب کو مثالی انداز میں پیش کیا ہے۔ یونانی مذہب پر عیسائیت کا غلبہ ہے۔ خاص طور پر یونانی آرتھوڈوکس چرچ جو مشرقی آرتھوڈوکس چرچ کی بڑی جماعت کے اندر ہے۔ اس میں ۲۰۱۵ء میں کل آبادی کے ۹۰٪ کی نمائندگی اور آئینی طور پر یونان کے مروجہ مذہب پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا مذہبی دستور کچھ یوں ہے کہ جب ان کے خدا سے کچھ مانگا جائے تو بدلے میں وہ اسی کی قربانی مانگتے ہیں۔ مائی نوس نے بھی اس دیوتا سے ایک بیل مانگ لیا لیکن دیوتا بدلے میں اسی کی قربانی چاہتا تھا کیونکہ سعید نقوی کے بقول ناخدا یا کم ظرفوں سے مانگو تو وہ بدلے میں اپنی انا کی تسکین تو خم از کم ضرور کراتے ہیں۔ اس مذہب میں بھی کچھ ایسا ہی تھا کیونکہ: ”پوسائیڈن کی شرط یہ تھی کہ مانوس ہو جانے کے بعد مائی نوس اسے پوسائیڈن کی راہ میں قربان کر دے گا۔ یہ گویا محبت کی قربانی ہوتی مائی نوس اسے قربان کرنے میں تامل کرے گا اور یوں پوسائیڈن اسے اپنی پسند کی سزا دے سکے گا۔“[30] اس افسانے میں مذہب کے حوالے سے اگر ناخداؤں کی بات کی جا رہی ہے تو خدا کو بھولنے والوں پر زوال کی طرف اس اشارہ کیا جا رہا ہے۔ جیسے مائی نوس کی بیوی کا بے راہ روی کا شکار ہو جانا۔

بیٹی کے دل میں باپ کے لیے نفرت ڈل جانا، یہ آدمی کا خوف ہے اگر اس کو سزا و جزا کا خوف نہ ہو تو وہ برائی کو عادت بنا لے۔ اگرچہ مائنوٹور انسانی جسم پر رہتا تھا لیکن یونانی افسانوں کے مطابق وہ برے پیدا نہیں ہوتے۔ اس کی ماں کے اس کی پرورش نہایت شفقت سے کی اور جب وہ بڑا ہوا تو وہ یونانی معاشرے کے لیے خطرہ بن گیا۔ سعید نقوی کے افسانے ''دین کے محافظ''میں مذہب کے غلط تصورات مذہبی ٹھیکیداروں کی منافقانہ زندگی، مکافاتِ عمل، افراد کی بے حسی اور انسان کی بے حرمتی کی داستان بیان کی جارہی ہے۔ اس افسانے میں مذہبی انتہا پسندوں کے ہاتھوں نوجوان نسل کے بگاڑ اور لادینیت کے پورے عمل کو دکھایا گیا ہے۔ یہ لوگ معاشرے سے ان افراد کو چناؤ کرتے ہیں جو زندگی سے مایوس ہوں پھر ان کو سبز باغ دکھائے جاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم اور کامیابی کا جھانسہ دے کر غیر ملکی دورے کروائے جاتے ہیں۔ اسی لالچ میں ان کو یوں برین واشنگ کی جاتی ہے کہ وہ خود ساختہ کمیونسٹ بن جائیں۔ انہیں جنت کی بشارت دی جاتی ہے اور ان کے ہاتھوں لوگوں کو یرغمال بنایا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک معصوم نوجوان لڑکا خالد اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو اپنے دوست شہزاد کو بھی اس راہ پر لگا لیا ہے جن کی تربیت یوں کی جارہی ہے کہ:''نام کا مسلمان۔۔۔۔کافروں سے خطرناک، ان کو رہنے دیا جائے تو مذہب ختم ہو جائے گا۔ ان کو مارنا ثواب ہے۔ کبھی غور سے قرآن پڑھا ہے۔''[31] چھ ماہ تک شہزاد کی تربیت اس نہج پر کی جاتی ہے کہ وہ اپنی اصل زندگی کو بھول جاتا ہے اور جہالت اور اندھیرے کی گہرائیوں میں ڈوب کر معصوم مسلمانوں کا بے دریغ قتل کرتا ہے اور آخر کار خود بھی مارا جاتا ہے۔

مذہب کے ان فریب کاروں سے پردہ فاش کرتا ہوا سعید نقوی کا ایک اور افسانہ ''مولوی عبدالحق'' ہے جس میں ان مکروہ چہروں سے نقاب ہٹایا جارہا ہے۔ جو مذہب کا لبادہ اوڑھے عورتوں کی عصمتوں سے کھیلتے ہیں۔ حمیدہ اس افسانے کا مرکزی کردار جو ایک عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ حمیدہ کی ماں نے مولوی عبدالحق کے گھر اس کو بطور نوکرانی بھیجا کہ ایک عمر رسیدہ بزرگ ہے دین دار ہے۔ بیٹی محفوظ رہے گی لیکن مولوی ہی اس پر غلط نگاہ رکھے ہوئے ہے اور اس کو اپنی طرف متوجہ کروانے کے لیے قبر کے عذاب سے ڈرا کر مذہب بدلنے کا کہتا ہے:''بعض نظریں احساس کو ننگا کر دیتی ہیں اور بعض نگاہیں انسان کے جسم کو۔۔۔ تجھے ڈر نہیں کہ یہ جسم جہنم میں چلا جائے گا۔ عبدالحق نے جہنم میں جلنے والے اس جسم کا ایسے بغور معائنہ کیا جیسے جلنے سے پہلے آخری دفعہ دیکھ رہے ہوں۔''[32]

حمیدہ کے مسلسل انکار پر عبدالحق اس پر ناموس رسالت ﷺ کی شان میں گستاخی کا الزام لگا کر پولیس کے حوالے کر دیتا ہے اور جب بھی انا کو تسکین نہیں ملتی تو اسے پھانسی لگوا کر عبرت کا نشان بناتا ہے۔ یہ افسانہ ایک طرف تو نام نہاد مذہبی ٹھیکیداروں کو طشت ازبام کرتا ہے تو دوسری طرف ایک عورت کا مذہب کے نام پر استحصال کرتے ہوئے اسے ایک کھلونے کی طرح استعمال ہوئے دکھاتا ہے۔ سعید نقوی کا افسانہ ''گرگٹ'' بھی ایسے ہی ایک مولوی ''مشتاق'' کی کہانی ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک گاؤں کی حقوق العباد کمیٹی کا چیئرمین ہے۔ اس لحاظ سے معاشرے کو بے راہ روی سے بچانا اور بے دین خیالات سے پاک رکھنا اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ایک دن میں سولہ کیس نبٹاتا ہے۔ جس میں ایک کیس عورت کا مقدمہ زنا ہے۔ مولوی مشتاق مجرم مرد کی داڑھی پر فیصلہ کرتا ہے اور اسے بری الذمہ قرار دے کر سارا الزام عورت کے کردار پر ڈال دیتا ہے۔''اس معاشرے کو سب سے بڑا خطرہ ان عورتوں سے ہے جو گھر کی چاردیواری سے نکل کر زندگی کے دھارے میں برابری سے حصہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔''[33] اس افسانے میں نامساعد سیاسی، سماجی اور مذہبی عناصر کو مذہبی آڑ میں اقتداری ہوس پرستی اور نسوانی حقوق کی پامالی سے باز رہنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ ''صبح کا بھولا'' سعید نقوی کا افسانہ ایک اور ایسا کردار ہمارے سامنے پیش کیا جارہا ہے جو ہمیں حقیقی زندگی میں اپنے اردگرد چلتے پھرتے نظر آتا ہے۔ اس افسانے کا واحد متکلم کردار ''میں'' ایسا شخص ہے

جو نمازی پرہیزی ہے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کرنے والا یہ کردار جعلی دوائیاں بیچتا ہے۔ یعنی اپنی اولاد کی صحت کی دعا کرنے والا لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کا دھیان اس طرف لانے کی کوشش کرتا ہے جس میں اس کا نوکر انور بھی سرفہرست ہے تو ان سے الٹا پوچھ گچھ شروع ہو جاتی ہے۔ کیا تم نماز پڑھتے ہو کیا کبھی روزہ رکھا ہے۔ "سارا شہر اجتماعی نیند سو رہا ہے اس میں کسے شک کہ یہ الہامی کلمات ہیں مگر کہیں ان کی تعبیر میں ہم سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی کہیں ایسا تو نہیں کہ بلا سوچے سمجھے کی تقلید میں ہم زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"[34]

ہمارے ہاں سب سے حساس موضوع مذہب ہے۔ منکر اسلام کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ جب ان کی ساری تدبیریں الٹی پڑ رہی ہوں تو وہ مسلمانوں کا آپس میں تفرقہ ڈال کر ایک دوسرے کا دشمن بنا سکتے ہیں۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات ہمارے ہاں ہمیشہ سے ہی چلتے آرہے ہیں۔ انہیں کو کہانی کی شکل میں بنتے ہوئے سعید نقوی افسانہ "رہزن ایمان" پیش کرتے ہیں۔

یہ معاملہ قبرستان میں تدفین کا ہے۔ دیوبند اور اہلِ سنت نے اپنے اپنے مردوں کو دفن کرنا ہے۔ لیکن دونوں قبریں غلط جگہ کھود دی جاتی ہیں اور دونوں فرقے بوڑھے گورکن پر بگڑتے ہیں۔ بوڑھا گورکن ان سے بدلہ یوں لیتا ہے کہ کچھ دنوں بعد بارش کے باعث کچی قبر سے ہڈیاں اُبل کر باہر آجاتی ہیں وہ ایک دوسرے کی ہڈیاں بدل دیتا ہے اور ان کی فرقہ واریت کا مذاق اُڑاتا ہے۔ دونوں فرقے ایک دوسرے کے مردے کو دعائیں دیتے ہیں۔ قبریں سجاتے ہیں اور بخشش کے لیے وظیفے پڑھتے ہیں۔ اس افسانے کا مقصد مردے کی تضحیک کرنا نہیں بلکہ ان کے گھر والوں کی اصلاح کرنا ہے۔ "دونوں ایک دوسرے کے مردے کو دعائیں دیتے رہے ایک دوسرے کے مردے کی بخشش کے وظیفے پر وظیفے پڑھتے رہے۔ باہر ایک دوسرے کو مار دیتے ہیں۔ پھر یہاں آکر ان کی مغفرت کے لیے فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔"[35]

جس طرح ہم اپنے مذہب کو اہمیت دیتے ہیں اسی طرح ہندو، سکھ یا کوئی بھی ہو وہ اپنے مذہب کو اہم سمجھے گا کیونکہ ہر مذہب انسانیت کا درس دیتا ہے اور ظلم وبربریت کے خلاف آواز اُٹھانے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ہم نے مذہب کی آڑ میں اخلاقیات اور تہذیب واقدار کا معیار اپنی منشاء ومرضی کے مطابق کر لیا ہے۔ "ایک عورت کی عام سی کہانی" سعید نقوی کا افسانہ بھی اسی طرز پر ہے۔ جہاں جسونت اور اکبر دوست ہیں۔ لیکن دونوں مختلف مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دوستی ڈیڑھ سو سال پرانی ہے لیکن آخر پر اس کی بھینٹ ایک بیٹی میں چڑھتی ہے۔ اکبر کی بیٹی روشن کا ہاتھ جسونت زبردستی مانگتا ہے اور انکار پر قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ فرمانبردار بیٹی قربانی کے لیے تیار ہے اور شادی کے بعد زہر کھانے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن مہندر کی محبت اسے اس کے ارادے سے ہٹا دیتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنا مذہب نہیں بدلتی یعنی مذہب سے محبت اور اس کی اقدار انسان کو جان سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ جن پر کوئی اور محبت غالب نہیں آسکتی۔ زندگی میں ہر چیز بدلی جا سکتی ہے۔ لیکن مذہب کا بدلنا انسان کو ذہنی طور پر تیار ہی نہیں کر پاتا یہی ہمارا راسخ عقیدہ ہے۔ مذہب کو کھلونا بنانے والے خود ہی اپنی عاقبت کے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔ دہشت گردی کے موضوع پر ہم نے پہلے بھی سعید نقوی کے کئی شاہکار افسانے دیکھے ہیں۔ "عید مبارک" افسانہ بھی انہیں لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ کہانی ایک چودہ سالہ لڑکے کی ہے جو والدین کی وفات کے بعد تنہائی اور جذباتیت کا شکار ہے یوں کہہ لیجیے خالی دکان شیطان کا گھر۔ تنہائی ختم کرنے کے لیے وہ ایک جہادی تنظیم کی شدت پسندی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ مذہب کے لبادے میں اسے جنت کی بشارت، شہادت کے فوائد، جہاد جیسی عظیم فہم، مقتدر ہستی کا قرب، راحت وعیش وآرام کے خواب دکھائے جاتے ہیں۔ تنظیم کا سربراہ حسام بن طاہر ہے ایسے کردار مذہب کا نام لے کر مذہبی پیشواؤں کا روپ دھار کر نہ صرف معاشرے میں بگاڑ، عدم برداشت، انتہا پسندی اور شدت پسندی کو فروغ دیتے ہیں بلکہ مذہب کی غلط تشریح کر کے اسے پوری دنیا میں بدنام

کرتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ تیری قربانی سے بہت خوش ہو گا۔ میرے رفیق اس پاک پروردگار نے اپنے شہیدوں کے لیے جنت میں ہمیشہ کی زندگی کا وعدہ کیا ہے۔“[36]

حاصل بحث

سعید نقوی کی مندرجہ بالا کہانیاں جھوٹے عالموں اور مذہبی ٹھیکیداروں کے منہ پر زبردست تمانچہ ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے ان نام نہاد مولویوں اور مذہبی راہنماؤں کے ظاہری اور کھوکھلے رویوں کا بڑے نوکیلے اور زہریلے انداز میں پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ ان نورانی اور باریش چہروں کا ظاہر جتنا پاکیزہ اور شفاف نظر آتا ہے۔ یہ اندر سے اتنے ہی میلے اور بدصورت ہیں۔

References

[1] Saeed Naqvi, *Nama Bar* (Karachi, Welcome Book Point, 2020), 5.
[2] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, P.N
[3] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 9.
[4] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 12.
[5] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 15.
[6] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 28.
[7] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 29.
[8]Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 37.
[9] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 63.
[10]Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 83.
[11]Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 116.
[12] Saeed Naqvi, *Tuk Tuk Dedam* (Karachi, A.G. Printers, 2013), 61.
[13] Saeed Naqvi, *Dhay Khane ki Chal* (Karachi, City Book House, 2018), 86.
[14] Saeed Naqvi, *Daire Se Bahar* (Karachi, City Book Point, 2022), 18.
[15] Saeed Naqvi, *Daire Se Bahar*, 28.
[16] Saeed Naqvi, *Daire Se Bahar*, 34.
[17]Saeed Naqvi, *Daire Se Bahar*, 48.
[18] Saeed Naqvi, *Daire Se Bahar*, 68.
[19] Saeed Naqvi, *Daire Se Bahar*, 100/.
[20]Saeed Naqvi, *Daire Se Bahar*, 102.
[21] Jameel Jalbi, *Qaumi Angrezi Urdu Lughat* (Islamabad, Muqtadra Qaumi Zuban, 1992), 238.
[22] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 22.
[23]Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 42.
[24] Saeed Naqvi, *Tuk Tuk Dedam*, 35.
[25] Muqtadi Hasan Azhari, *Hafifa Tul Adab Wazifata*, 43.
[26] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 26.
[27] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 27.
[28] Saeed Naqvi, *Nama Bar*, 57.
[29]Saeed Naqvi, *Daire Se Bahar*, 76/.
[30] [30] Saeed Naqvi, *Nama Bar*,68.
[31]Saeed Naqvi, *Dusra Rukh* (Karachi, A.G. Printers, 2011), 82.
[32]Saeed Naqvi, *Dusra Rukh*, 143.
[33]Saeed Naqvi, *Dusra Rukh*, 138.
[34]Saeed Naqvi, *Tuk Tuk Dedam*, 77.
[35]Saeed Naqvi, *Dhay Khane ki Chal*, 151.
[36]Saeed Naqvi, *Dhay Khane ki Chal*, 185.